بسم اللہ الرحمن الرحیم

اجتہاد اور اس کی عصری تطبیقات

محمد امین

حال ہی میں راقم کو اس علماء کنونشن کی مطبوعہ روداد کا تفصیلی مطالعہ کرنے کا موقع ملا جو ۴ اور ۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو صدر پاکستان کی زیر صدارت اسلام آباد میں منعقد ہوا ۔ اس کنونشن میں جو مختلف کمیٹیاں بنائی گئی تھیں ان میں ایک اجتہاد کمیٹی بھی تھی ، اس کمیٹی نے جو سفارشات پیش کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ :

"پاکستان کے اندر ایسے جید علماء و فضلاء کا بورڈ تشکیل دیا جائے جن کی دیانت ، تبحر علمی ، تقویٰ ، عربی زبان پر عبور اور علوم قرآنی اور حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ان کا مطالعہ ہی نہ ہو بلکہ پاکستانی عوام بھی ان پر پورا اعتماد رکھتے ہوں ۔ نیز بورڈ کے علماء کی معاونت کے لئے اس بورڈ کو ملک کے اندر پیدا ہونے والے قانونی مسائل کے حل کے لئے استخراج و استنباط کی ذمہ داری سپرد کی جائے "(۱) ۔

اس تجویز پر بحث کرتے ہوئے جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ، جج شرعی بنچ عدالت عظمیٰ پاکستان نے فرمایا کہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام نے اجتہاد کے لئے عیسائیت کی طرح توریثی اقتدار اعلیٰ تنظیم قائم نہیں کی اور یہ کہ

ان کے خیال میں کسی ایسے ادارے کا قیام مناسب نہیں ہے جو اجتہاد کے معاملے میں حرف آخر کا درجہ رکھے اور پھر اس کے خلاف اجتہاد کرنے کا کوئی راستہ نہ رہے (۲) ۔

اس بات سے قطع نظر کہ جس کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی تھی وہ ۲۷ علماء اور اسکالرز پر مشتمل تھی اور اس میں ملک بھر کے جید علماء شامل تھے ، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا عثمانی صاحب کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرنا مشکل ہے اور معاملے کی علمی اور عملی اہمیت کے پیش نظر یہ غیر مناسب نہ ہوگا اگر اس پر ذرا تفصیلی غور کر لیا جائے ۔

سوال یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی تاریخی نمو جس طرح ہوئی کیا وہ ایک طے شدہ اور مثالی طریق کار تھا یا وہ حوادث زمانہ کے پیش نظر ، ان مخصوص حالات کے اندر ایک بہتر طریق کار تھا (Best in the Situation) اور کیا ان سیاسی اور اجتماعی حالات کے بدل جانے کے بعد معاملے پر از سر نو غور کیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟ ہمارے نزدیک دوسرا نقطۂ نظر صحیح ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ میں اور خصوصاً حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں جتنے بھی اجتہادی فیصلے ہوئے وہ ,, سرکاری سطح پر ہوئے اور ان کی حیثیت ,, شورائی اجتہاد ،، کی تھی اگرچہ ان میں آزادانہ بحث و مناظرہ ہوا ، بعض حضرات نے کھلم کھلا خلیفہ وقت (جو خود بھی مجتہد ہوتا تھا) کی رائے سے باصرار اختلاف کیا لیکن فیصلہ بہرحال خلیفہ کی صدارت میں اور شوریٰ کی رائے سے ہوا ۔ اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خلافت راشدہ کا نظام جاری نہ

رہ سکا اور اس نظام کو جاری رکھنے کی جدوجہد میں مصلحین امت اور سیاسی حکمرانوں کے درمیان جو تصادم ہوا وہ بظاہر دوسرے فریق کی شکست پر منتج ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی حضرت امام حسنؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت سے جو صدمہ امت اور علماء و صلحاء امت کو پہنچا اور اس سے جو رویے مستحکم ہوئے، انہوں نے اقتدار اور اہل علم میں ایک مستقل تفریق سی پیدا کر دی۔ علماء نے اقتدار سے قطع تعلق کر لیا اور مسجد و مدرسہ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور سیاسی حکمران آہستہ آہستہ دنیادار ہوتے گئے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنو امیہ کے ابتدائی حکمرانوں میں جو علم اور دینی رسوخ موجود تھا وہ بعد میں معدوم ہوتا چلا گیا اور خلافت بھی وراثت میں بدل گئی۔ اس تفریق کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ شوریٰ کا ادارہ ختم ہو گیا، حکمرانوں نے اپنی من مانی شروع کر دی اور امور مملکت میں مشورے کے لئے وہ اپنے وزراء اور حکام پر تکیہ کرنے لگے۔ لیکن جہاں تک دینی امور کا تعلق تھا چونکہ ایسے حکمران اور ایسی شوریٰ باقی نہ رہی تھی جس پر عوام کو اعتماد ہوتا، کیونکہ حکمران اپنی سیاسی اغراض کی خاطر اب ایک ایسی شوریٰ بنانے پر تیار نہ تھے جس کو کوئی قوت اور رسوخ حاصل ہوتا اور ان کی اپنی مرضی نہ چل سکتی، اس صورت حال میں عوام نے دینی مسائل میں علماء و صلحا امت سے رجوع کرنا شروع کر دیا اور اجتماعی شورائی پلیٹ فارم کی غیر موجودگی میں معاملات انفرادی فتاویٰ پر چلنے لگے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ترکی خلافت کے بعد مسلمان ممالک آہستہ آہستہ مغربی قوموں کی سیاسی غلامی سے آزاد ہونا شروع ہوئے اور اب

ان کی کثیر تعداد آزاد ہو چکی ہے۔ کمزوری اور زیردستی کے بعد اب جو نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا ہے اور اس میں جو سیاسی ادارے وجود میں آئے اور آ رہے ہیں ان کی اپنی خوبیاں اور کمزوریاں ہیں (جس طرح کہ پرانے وراثتی خلافتی نظام کی بعض خوبیاں اور کمزوریاں تھیں) ۔ موجودہ دور کے مسلمان معاشروں کا المیہ یہ ہے کہ یہاں مغربی فکر اور مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد (خصوصاً وہ لوگ جو قانون و سیاست اور انتظام ملکی سے متعلق ہیں) مغرب کے اس تعلیمی اور تہذیبی اثرات کے حصار سے نکلنے پر قادر نہیں ہیں ، اور نہ ہی اس کے لئے تیار ہیں کیونکہ اس میں انہیں نفسیاتی ، معاشی ، معاشرتی اور پیشہ ورانہ الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور قربانی دینا پڑتی ہے،

اس ضمن میں ایک تازہ مثال بے مصرف ثابت نہ ہوگی ۔ حضرت علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال (چیف جسٹس ، پنجاب) نے حال ہی میں اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ اجتہاد کے لئے عربی دانی کی شرط ختم کر دی جائے تاکہ وکلاء اجتہاد کر سکیں (۳) ۔ کیا ڈاکٹر صاحب تصور کر سکتے ہیں کہ کوئی صاحب انگریزی قانون میں پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھیں اور انہیں انگریزی زبان نہ آتی ہو ۔

اب اجتہاد ، شوریٰ اور پارلیمنٹ کے مسئلے کو لیجیئے ، مغربی جمہوری نظام میں چونکہ حاکمیت عوام کے لئے ہے ، اس لئے جو لوگ ان کے نمائندے منتخب ہوتے ہیں انہیں قانون سازی کا مطلق حق حاصل ہوتا ہے ، اب یہ بات اسلامی معاشرے میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے کیونکہ اسلام میں مسلمانوں کے لئے مطلق قانون سازی

کا کوئی تصور ہے ھی نہیں ، یہاں قانون دینے والے خود اللہ سبحانہ، تعالیٰ ھیں ، البتہ قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے ۔ پچھلی صدیوں کے عظیم فقہی سرمائے پر ذرا ایک نظر ڈالیئے اور غور کیجیئے کہ کیا اس عرصے میں کوئی ایک بھی ایسا عالم ، فقیہہ یا اصولی گزرا ہے جس نے یہ کہا ھو کہ اجتہاد کے لئے قرآن و سنت اور عربی زبان میں مہارت شرط نہیں ہے ، اس کے برعکس فقہاء کرام تو علوم عربیہ سے ناآشنا لوگوں کو اجتہاد کے میدان میں قدم رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے ۔ امام غزالیؒ فرماتے ھیں ،، ایک عام آدمی اجتہاد نہیں کر سکتا کیونکہ اھلیت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اس کام کے لئے اسی طرح نا اھل ہے جس طرح نابالغ بچہ اور فاتر العقل آدمی (۴)،، ۔ امام شافعی نے فرمایا ،،اجتہاد کی اھلیت نہ رکھنے والا اگر اجتہاد کرے تو اس کی حیثیت اس اندھے کی سی ہے جو خود بھی رستہ نہیں دیکھ سکتا (دوسرے کو کیا دکھائے گا) اس کے باوجود اگر وہ اجتہاد کرے تو گناہ گار ھوگا ، حکومت کو چاھیئے کہ زبردستی اسے اس کام سے روک دے (۵) اور عربی زبان کے متعلق تو امام شاطبی نے یہاں تک کہا ہے کہ ،،اجتہاد کرنے والے کو ،، مجتہد فی اللغۃ ،، ھونا چاھیئے اگرچہ یہ اجتہاد کے وسائل میں سے ہے ،، (۶) ۔

تو کیا اس قسم کی صفات ھمارے قومی اسمبلی یا مجلس شوریٰ کے ممبران میں ھوتی ھیں (جن کا ذکر فقہاء اور اصولیین نے متفقہ طور پر کیا ہے) یا کیا یہ شرط ان کے لئے رکھ کر قومی اسمبلی کے لئے الیکشن کروائے جا سکتے ھیں ؟ ظاھر ہے یہ ناممکن ہے اور نہ اس

پر کوئی تیار ہوگا ۔ اب دوسری طرف دیکھیئے کہ اگر علماء کی کوئی کونسل یا بورڈ بنایا جائے (کیونکہ علماء ہی میں یہ شروط ممکنہ حد تک موجود ہو سکتی ہیں) تو اسے ,, مشاورتی ،، کا درجہ دے دیا جائے گا اور بات پھر انہی حکمرانوں اور سول سروس کے ارباب اختیار پر پہنچ کر رک جائے گی وہ مناسب سمجھیں تو اس کونسل یا بورڈ کی سفارشات کو مانیں اور چاہیں تو نہ مانیں۔اس کا حل یہی ہے (اور یہی اسلامی نقطۂ نظر سے مطلوب بھی ہے) کہ ایسے علماء اور سکالرز کو عوام کا معتمد علیہ ہونا چاہیئے ۔ اب موجودہ زمانے میں اس اعتماد اور پہچان کی ایک ہی صورت قابل اعتماد رہ گئی ہے اور وہ انتخاب کی ہے ، لہذا ہمیں کوئی ایسا راستہ سوچنا ہوگا کہ الیکشن کی قباحتوں سے بچ کر اس طرح کے لوگ مجلس شوریٰ، اسمبلیوں میں پہنچ سکیں تاکہ وہ اجتہاد کر سکیں اور یہ اجتہاد امت کے لئے قابل قبول بھی ہو ، ورنہ اگر دین سے ناواقف لوگ اجتہاد کرتے بھی رہیں اور قانون بناتے بھی رہیں تو ان کی رائے کو یقیناً کوئی پذیرائی نہ ہوگی ۔ وہ غیر اسلامی قانون بناتے رہیں گے اور لوگ ان کی مخالفت کرتے رہیں گے اور اس طرح ہماری صلاحیتیں باہمی انتشار کا شکار ہوتی رہیں گی ۔

ضروری نہیں ہے کہ شوریٰ یا اسمبلی کے سارے ممبران میں متخصص فقہاء ہوں بلکہ خلفاء راشدین کے تعامل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شوریٰ میں دو طرح کے لوگ تھے ، ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو قبیلوں کے سربراہ اور علاقوں کے معززین تھے اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو قرآن و سنت اور فقہ

کا گہرا اور خصوصی علم رکھتے تھے ، عمومی مسائل میں ساری شوری سے رائے لی جاتی تھی لیکن پیچیدہ دینی اور فقہی مسائل میں صرف ان متخصص حضرات کو رائے اور بحث کے لئے بلایا جاتا تھا (۱) ۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ شوری میں اکثریت ان لوگوں کی ہو سکتی ہے جو عوام کے معتمد ہوں ان میں بارسوخ ہوں ، اسلامی احکام کو جاننے والے اور ان پر عمل کرنے والے ہوں اور زندگی کے مختلف شعبوں کے مسائل سے ماہرانہ واقفیت رکھتے ہوں لیکن ان ممبران میں بہرحال کچھ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہونی چاہیئے جو قرآن و سنت نیز فقہ اور عربی زبان میں خصوصی مہارت رکھتے ہوں ، فقہی اور قانونی معاملات میں ان کی رائے کو باقی لوگوں کی رائے پر وزن حاصل ہونا چاہیئے ۔

اب مسئلہ اس فکر کو دستوری صورت دینے کا ہے تو اس کے لئے کئی صورتیں ممکن ہیں ۔ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ الیکشن میں سیاسی جماعتیں حصہ لے رہی ہوں اور انتخابات متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہوں ، سیاسی جماعتوں کو پہلے سے باخبر کر دیا جائے کہ انہیں اپنی فہرست میں علماء اور سکالرز کو رکھنا چاہیئے جو کامیابی کی صورت میں شوریٰ یا اسمبلی کے اندر ان کی نمائندگی کر سکیں ۔ مجلس شوریٰ میں سیاسی جماعتوں کی حاصل کردہ نشستوں کے تناسب سے ہر جماعت کو ایک ایسی کمیٹی میں نمائندگی دی جائے جسے ,, اجتہاد کمیٹی " یا ,, قانونی کمیٹی " یا ,, لیجسلیٹو کمیٹی " (Legislative Committee) کہا جائے ۔ یہ ایک خود مختار کمیٹی

ہو جو اپنا چیئرمین خود چنے اور اپنا طریق کار خود وضع کرے ۔ انتخابی قواعد میں ایک قانون کا اضافہ کیا جائے جس میں اس کمیٹی کے ممبران کی صفات و شروط بیان کر دی جائیں (اور یہ شروط وہی ہوں جو سارے علماء و فقہاء اور اصولیوں کے نزدیک متفقہ ہیں اور جو مجتہدین کی صفات کے طور پر فقہ اور اصول فقہ کی ساری کتابوں میں مندرج ہیں) اور کمیٹی کو یہ حق ہو کہ اگر وہ دو تہائی اکثریت سے یہ سمجھے کہ اس کے کسی ممبر میں اس طرح کی مطلوبہ صفات نہیں پائی جاتیں تو وہ اس کی ممبر شپ ختم کر دیں اور متعلقہ سیاسی جماعت اس کی جگہ اسمبلی میں منتخب شدہ کسی دوسرے آدمی کا نام دے ۔ سارے مسودہ ہائے قانون، مجلس شوریٰ میں ابتدائی اور عمومی بحث کے بعد اس کمیٹی کو بھجوا دیئے جائیں ، اس کمیٹی کو یہ اختیار ہو کہ وہ ہر قسم کے ماہرین کی خدمات سے استفادہ کر سکے ۔ اس کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہو اگرچہ مجلس شوریٰ کے باقی ممبران اور صدر مملکت اس کمیٹی کے پاس کردہ بل کو غور کے لئے ، بمع مطلوبہ ترمیمات کے ، کمیٹی کے پاس واپس بھجوا دیں لیکن انہیں ان کے رد کرنے کا اختیار نہ ہو ۔ پرانے غیر اسلامی قوانین پر نظر ثانی کا کام بھی یہی کمیٹی کر سکتی ہے ، نیز اس کمیٹی کے پاس کردہ قانون کو عدالت عظمیٰ میں اس بنیاد پر چیلنج کیا جا سکے کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف ہیں بشرطیکہ عدالت کے جج قانون شریعت کے ماہرین پر مشتمل ہوں اور ان صفات کے حامل ہوں جو اس اجتہاد کمیٹی کے ممبران کے لئے قانون نے مقرر کی ہوں ۔

ہماری رائے میں صرف اس طرح کا ایک ادارہ ہی ہماری موجودہ قانونی مشکلات کو حل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے جو منتخب اور با اختیار بھی ہو اور اہل لوگوں پر مشتمل بھی ہو۔ غیر جماعتی الیکشن کی صورت میں یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ جو علماء اور اسکالرز بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچیں ان پر مشتمل یہ کمیٹی بنا دی جائے۔ باقی تفصیلات ممکنہ حد تک وہی ہوں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

حواشی

۱۔ تقاریر و تجاویز علماء کنونشن مطبوعہ وزارت مذہبی امور صفحہ ۲۱۱۔

۲۔ تقاریر و تجاویز علماء کنونشن مطبوعہ وزارت مذہبی امور صفحہ ۹۵۔

۳۔ جسارت کراچی ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴ء۔ سرگودھا بار سے خطاب۔

۴۔ المستصفی الغزالی جلد ۱ صفحہ ۱۸۲ طبع دارالصادر۔

۵۔ الرسالہ للشافعی صفحہ ۵۰۹ طبع دار التراث بالقاہرہ۔

۶۔ الموافقات للشاطبی جلد ۴ صفحہ ۱۰۸ طبع المکتبۃ التجاریۃ۔

۷۔ معاصرین میں سے جنہوں نے اس رائے کو اختیار کیا ہے ان میں شیخ ذکریا البری (مجلہ ,, عالم الفکر ، الکویت ، شمارہ جنوری۔ مارچ ، ۱۹۷۱ صفحہ ۱۳۱) اور ڈاکٹر محمد یعقوب المليجی (کتاب مبدأ الشوریٰ فی الاسلام ، صفحہ ۲۳۳ طبع اسکندریہ) قابل ذکر ہیں۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگرچہ سیاسۃ شرعیۃ پر لکھنے والے فقہاء نے اہل الشوریٰ ، اہل الحل والعقد اور اہل الاختیار کی اصطلاحیں بطور مترادف کے استعمال کی ہیں لیکن بعض فقہاء نے ان میں علماء اور ,, اہل الاجتہاد ،، کو شامل کیا ہے مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

- عبدالقاہر البغدادی ، اصول الدین ، صفحہ ۲۷۹ طبع بیروت ۱۴۰۰ھ
- قاضی ابویعلی ، الاحکام السلطانیۃ ، صفحہ ۱۹ طبع مصر ۱۳۸۷ھ
- امام نووی، منہاج الطالبین و عمدۃ المفتیین ، صفحہ ۱۲۰ طبع مصر ۱۳۸۰ھ۔